ڈاکٹر محمود احمد غازی
سابق وائس چانسلر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی

# عہد حاضر اور شریعت اسلامی

## علم کلام: عقیدہ و ایمانیات کی علمی تشریح و تدوین

وفاقی شرعی عدالت کے سابق جج اور انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد کے سابق چانسلر اور معروف اسکالر اسلامی ڈاکٹر محمود احمد غازی کی نئی زیر طبع کتاب ''عہد حاضر اور شریعتِ اسلامی'' کا ایک باب قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔ دراصل انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز - اسلام آباد نے گزشتہ برس ڈاکٹر محمود احمد غازی کے خطبات ''محاضراتِ شریعت'' کے عنوان سے اپنے ہاں منعقد کرائے تھے۔ انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز نے ماہنامہ ''الحق'' کے لئے یہ اہم مقالہ خصوصیت کے ساتھ بھیجا ہے۔ ادارہ ''الحق'' انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے اس علمی تعاون کیلئے اس کا شکر گزار ہے۔ قارئین کے علمی ذوق اور معلومات کیلئے اہمیت کے ساتھ اسے دو قسطوں میں شائع کیا جارہا ہے۔ (مدیر)

**نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم.** برادران و خواہرانِ گرامی! آج کی گفتگو کا عنوان، جیسا کہ آپ نے سماعت فرمایا، ''علم کلام: عقیدہ و ایمانیات کی علمی تشریح و تدوین'' ہے۔ اس موضوع، یعنی عقیدہ و ایمانیات، پر ایک گفتگو اس سے قبل پیش کی جا چکی ہے، جس کے بارے میں عرض کیا گیا تھا کہ وہ نظام شریعت کی اولین اور سب سے پہلی اساس ہے۔ عقیدہ اور ایمانیات میں جو مضامین شامل ہیں وہ اس عمارت کے لئے بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں جس کو شریعت کہا جاتا ہے۔ یہ بنیاد جس کی اساسات قرآن پاک میں موجود ہیں، جس کی وضاحت و تشریح احادیث نبویؐ میں کی گئی ہے اور جس پر صحابہ کرامؓ کے زمانے سے اہل علم اور اہل دانش غور کرتے چلے آرہے ہیں، اسلام کے پورے نظام میں بنیاد اور شریعت کے جسم میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس بنیاد سے متعلقہ مسائل کو جب علمی اعتبار سے مرتب کیا گیا اور فنی اعتبار سے مرتب دلائل کے ساتھ ان امور کو پیش کیا گیا تو اس کاوش نے علم کلام کا نام اختیار کیا۔ جلد ہی اس علم کو اسلامی علوم و فنون میں ایک بنیادی مقام اور اہم حیثیت حاصل ہوئی۔

قبل ازیں یہ بات میں نے عرض کی تھی کہ جس کو ہم اسلامی اصطلاح میں عقیدہ کہتے ہیں وہ dogma سے مختلف چیز ہے۔ عقیدہ کو dogma قرار دینا یا کوئی ایسا مفروضہ سمجھنا کہ جس کی بنیاد کسی عقلی استدلال پر نہ ہو، درست نہیں ہے۔

ڈوگما سے مراد تو محض وہ چیز ہے کہ جس کو کسی عقلی بنیاد کے بغیر محض اصول موضوعہ کے طور پر مان لیا جائے اور جس میں ایک تحکمانہ انداز شامل ہو، اور جیسا کہ بعض مغربی ماہرین نے لکھا ہے، جسکو ایک arbitrary اور ایک derogative انداز میں (یہ دونوں اسکے بنیادی عناصر ہیں) لوگوں سے منوایا جائے۔ عقیدہ ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ لیکن چونکہ دنیا کے مختلف مذاہب میں اپنے مذہبی عقائد کی علمی تعبیر وتشریح کی روایت موجود ہے اسلئے مختلف مذاہب میں کلام سے ملتے جلتے علوم مختلف ناموں سے موجود ہیں اور جب اسلامی علم کلام کی بات آتی ہے تو دوسرے مذاہب کی مماثل اصطلاحات بلا تامل استعمال کرلی جاتی ہیں۔ چنانچہ dogma یا scholasticism یا theology یا اس طرح کی دوسری اصطلاحات کثرت سے علمِ کلام کے سیاق وسباق میں استعمال ہوتی ہیں۔ یہ اصطلاحات جزوی طور پر تو علم کلام کے مندرجات اور خصائص کی ترجمان ہوسکتی ہیں، لیکن ان اصطلاحات کو مکمل طور پر علم کلام کا مترادف قرار دینا مشکل ہے

علم کلام اسلامی فکر کا ایک انتہائی بنیادی اور اہم مضمون ہے۔ جس چیز کو ہم فکر اسلامی کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں اس میں خالص مذہبی فکر بھی شامل ہے، اس میں مسلمانوں کا فلسفیانہ فکر بھی شامل ہے، فکر اجتماعی بھی شامل ہے اور فکر سیاسی بھی شامل ہے۔ لیکن جن حضرات نے فکر اسلامی کی تاریخ لکھی ہے یا اس پر غور وفکر کیا ہے ان میں سے بعض بالغ نظر حضرات کا کہنا ہے کہ فکر اسلامی کے سب سے نمایاں اور سب سے قابل ذکر پہلو دو ہیں: ایک مسلمانوں کا اصول فقہ اور دوسرا علمِ کلام۔ ان دونوں میدانوں میں مسلمانوں کی منہاجیات کا اور اس منہاجیات کی اصالت یعنی originality کا سب سے زیادہ اظہار ہوتا ہے۔ اسلامی فکر میں کیا کیا جدتیں ہیں؟ اسلامی فکر نے انسانیت کو کیا عمومی فکروی؟ اس کا سب سے زیادہ پختہ اور بہترین نمونہ اور مکمل نمونہ ہمیں اصول فقہ میں ملتا ہے، یا پھر علم کلام میں۔ یہی وجہ ہے کہ علم کلام اور اصول فقہ ان دونوں میں کئی مضامین مشترک ہیں۔ نہ صرف مضامین کا اشتراک ہے بلکہ بہت سے ایسے حضرات جنہوں نے علم کلام میں اپنی ترکتازیوں کو دنیا کے علمی حلقوں میں منوایا ہے، وہی حضرات ہیں جنہوں نے اصول فقہ میں بھی بڑا نمایاں کام کیا ہے۔ اسی طرح سے اصولِ فقہ کے جید ترین علماء وہ ہیں جو علم کلام کے بھی جید ترین علماء ہیں۔ ان اسباب کی بناء پر ان دونوں میں بعض مشترک مضامین اور سوالات بھی پیدا ہوئے۔

آج مغربی دنیا meta-jurisprudence کے نام سے مانوس ہے، جس سے مراد وہ مابعد الطبیعی سوالات ہیں جن کی بنیاد پر اصول قانون کے مسائل مرتب ہوتے ہیں۔ اگر meta-jurisprudence کے نام سے کوئی علم وجود رکھتا ہے اور واقعتاً jurisprudence کی کوئی مابعد الطبیعی اساس ہے تو پھر meta-jurisprudence کی تاسیس کا شرف متکلمین اسلام کو حاصل ہے۔ متکلمین اسلام نے وہ سوالات اٹھائے جو آگے چل کر علم کلام اور اصول فقہ دونوں کی بنیاد بنے۔ ان سوالات میں سب سے بنیادی سوال یہ تھا کہ کسی چیز کے اچھا یا برا ہونے کا آخری معیار کیا ہے؟ کسی چیز کو اچھا کس بنیاد پر قرار دیا جائے اور برا کس بنیاد پر قرار دیا جائے؟ بالفاظ دیگر حسن وقبح کا حتمی معیار اور آخری کسوٹی کیا

ہے؟ حسن وقبح عقلی ہیں یا شرعی؟ یہ خلاصہ ہے اس سوال کا جو متکلمین اسلام نے بھی اُٹھایا اور تقریباً تمام قابل ذکر علماء صول نے بھی اٹھایا۔ یہ ایک فلسفیانہ سوال بھی ہے، یہ ایک متکلمانہ سوال بھی ہے اور یہ اصول قانون اور اصول فقہ کا سوال بھی ہے۔ اس سوال کے جواب میں جو بحثیں علماء اصول مثلاً امام رازی، امام غزالی، علامہ آمدی، امام الحرمین اور ان کے درجہ کے دوسرے اکابر اصول وکلام نے کی ہیں وہ اسلامی فکر کا ایک نہایت نمایاں اور درخشاں باب ہے۔

جس طرح علم کلام بیک وقت علوم نقلیہ اور علوم عقلیہ کے خصائص کا جامع ہے اسی طرح علم اصولِ فقہ بھی علوم عقلیہ اور علوم نقلیہ دونوں کے خصائص کا جامع ہے۔ اصول فقہ کا کوئی طالب علم یہ نہیں کہہ سکتا کہ اصول فقہ کے کوئی مسائل یا احکام ایسے بھی ہیں جو اسلام کی منصوص تعلیمات سے مکمل طور پر ہم آہنگ اور ان سے ماخوذ نہیں ہیں۔ اسی طرح جس جس دور میں اصولِ فقہ کی جو کتاب مرتب ہوئی، خاص طور پر نمائندہ کتابیں، اس زمانے کا کوئی بڑے سے بڑا ماہر عقلیات یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ رائج الوقت معیارِ عقلیات کی رو سے اصول فقہ کا فلاں نقطہ نظر عقلیات کے ماہرین کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ امام غزالی کی المستصفیٰ ہو یا امام رازی کی المحصول، یا پھر دیگر جید اکابر علماء اصول کی کتابیں ہوں، ان سب کتابوں میں یہ دونوں امتیازی اوصاف اور ان دونوں میدانوں کے تقاضے بدرجہ اتم موجود ہیں۔

یہی بات جو اصول فقہ کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے وہ علمِ کلام کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے کہ جہاں علم کلام ایک خالص منقول علم ہے، اس اعتبار سے کہ قرآن پاک اور سنتِ رسولؐ کی منقولات پر مبنی ہے، وہاں وہ ایک خالص عقلی علم بھی ہے کہ متکلمین اسلام نے عقلی استدلال کی بنیاد اور رائج الوقت معیارات کے لحاظ سے جو اعلیٰ ترین عقلی معیارات تھے اُن کی بنیاد پر اس علم کو مرتب کیا اور ان دونوں کے تقاضوں کو نبھانے کی کوشش کی۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ مغربی فضلاء میں بہت سے حضرات نے اصول فقہ اور علم کلام کے اس امتیازی وصف کا زیادہ نوٹس نہیں لیا۔ اس پہلو سے علم کلام کا جائزہ چند ہی مغربی اہلِ علم نے لیا ہے اور جنہوں نے غیر جانبداری سے اس وصف کا نوٹس لیا ہے انہوں نے بہت سنجیدگی سے اور پوری ذمہ داری سے یہ بات تسلیم کی ہے جو میں نے عرض کی ہے۔ تاہم دنیائے استشراق میں ایسے افراد کی بھی کمی نہیں جنہوں نے اس اہم بات کو نظر انداز کر دیا اور علم کلام کو ایک deffensive apologetics یا defence apologia کے نام سے یاد کیا۔ ایک اور مغربی فاضل نے علمِ کلام کو discursive and reasoned apologia کے نام سے یاد کیا۔ Apology کا لفظ ان میں سے بہت سے حضرات میں مشترک ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر متکلمین اسلام کی شروع کی تحریریں دیکھی جائیں، خالص متکلمین کی، تو ان میں ذرہ برابر معذرت خواہی کا یا دفاعی انداز کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ دفاعی انداز ابن سینا، فارابی، ابن رشد اور چند دیگر فلاسفہ میں تو کسی حد تک شاید پایا جاتا ہو، لیکن خالص متکلمین کے ہاں، جن کا آغاز امام ابوحنیفہؒ سے کیا جاسکتا ہے، یہ مدافعانہ انداز نہیں پایا جاتا۔ مدافعانہ انداز کا علم کلام بیسویں صدی کے اوائل اور انیسویں صدی کے اواخر میں سامنے آیا، جس پر گفتگو کے آخر

میں چند ضروری اشارات پیش کروں گا۔۔۔۔ انسانی فطرت کا ایک جبلی داعیہ ہے کہ وہ حقائق کائنات کے بارے میں عقلی تفکیر سے کام لیتی ہے۔ ہر انسان اپنی عقلی سطح اور صلاحیت کے مطابق اپنے نقطۂ نظر کی عقلی توجیہ پیش کرتا ہے۔ یہ عقلی توجیہ تمام علوم اجتماعی اور علوم انسانی کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں ہر ذی عقل انسان نے محسوس سے لامحسوس کا، ظاہر سے خفی کا اور موجود سے غیر موجود کا پتا چلانے کی کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ قبل از اسلام کے عرب بدو بھی ایک سادہ انداز میں اور ایک خالص ابتدائی نوعیت کے اسلوب سے یہ کام کرتے تھے۔ ایک عربی ضرب المثل ہے "البعرة تدل على البعير" یعنی اونٹ کی مینگنی پڑی ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں سے اونٹ گزرا ہے۔ اب یہ موجود سے غیر موجود کا پتا لگانے کی بہت ابتدائی سی مثال ہے۔

اسی طرح سے مذاہب اور مذہبی عقائد پر اعتراضات اور اشکالات کی مثالیں بھی قدیم سے چلی آ رہی ہیں۔ اخلاقی اصولوں پر ایرادات بھی اتنے ہی قدیم ہیں جتنے اخلاقی اصول قدیم ہیں۔ جس طرح مذاہب، اخلاقیات اور عقائد کا نظام قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے اسی طرح ان پر اشکالات اور اعتراضات کا سلسلہ بھی زمانہ قدیم سے جاری ہے۔ قدیم سے قدیم اقوام میں اور ابتدا ہی سے ابتدائی تہذیبوں میں بھی فلسفیانہ سوالات اور عقلی مباحث کا سراغ ملتا ہے۔ حتیٰ کہ انتہائی primitive تہذیبوں کے بارہ میں بھی اب جو چیزیں شائع ہوئی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس طرح کے سوالات نہ صرف قدیم سے قدیم انسانی معاشروں میں موجود تھے، بلکہ ان سے اعتناء کرنے والے بھی موجود تھے۔ لہٰذا یہ بات قابل حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ اگر مسلمانوں نے پہلے دن سے اسلام کے عقائد کی عقلی تعبیر کرنے کی کوشش کی اور اسلام کے عقائد کو ایک ایسے اسلوب میں پیش کرنا چاہا جو عقلیت زدہ یا عقلیت سے متاثر انسانوں کے لیے قابل قبول ہو۔۔۔ علم کلام ایک خالص اسلامی علم ہے، اس اعتبار سے کہ اس کی اساس قرآن پاک اور سنت رسولؐ ہے۔ یہ بات انتہائی اہم ہے کہ جس دور اور جس علاقے میں کلامی مسائل سب سے پہلے سامنے آئے وہ دور، وہ زمانہ اور وہ علاقہ ایسا تھا جو اس وقت تک دوسری تہذیبوں کے زیر اثر نہیں تھا۔ خالص مکہ مکرمہ کے ماحول میں، مدینہ منورہ کے ماحول میں، کوفہ کے ماحول میں جو خالص اسلامی بستیاں تھیں اس طرح کے عقلی مسائل اور سوالات اٹھائے گئے اور ان کے جوابات دیے گئے۔ یہ بات کہ یونانی، مزدکی اور عیسائی مفکرین کی تحریریں مسلمان مفکرین کو دستیاب تھیں، جن کے زیر اثر علم کلام کا آغاز ہوا، تاریخی اعتبار سے بہت کمزور اور بے بنیاد بات ہے۔ بلاشبہ مسیحی مفکرین کی تحریریں عربی میں ترجمہ ہوئیں، یہ ایک تاریخی واقعہ ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور ان تحریروں کے اثرات بھی بعد کے متکلمین پر محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ علم کلام کی تاریخ کا ایک طویل عرصہ ایسا گزرا ہے جب متکلمین اسلام ان تمام اثرات سے آزاد تھے اور یہ تحریریں متکلمین اسلام کے سامنے نہیں تھیں۔

جس زمانے میں امام ابوحنیفہ یا ان کے تلامذہ کتاب الفقہ الاکبر لکھ رہے تھے اس زمانے میں کوفہ میں شاید کوئی

یونانیوں کا نام بھی نہ جانتا ہو۔اس حقیقت سے کوئی مغربی فاضل بھی اختلاف نہیں کرسکتا کہ جس زمانہ میں کتاب الفقہ الاکبر لکھی جارہی تھی اس زمانہ میں امام ابوحنیفہؒ کے سامنے یونانیوں کی کتابیں نہیں تھیں، امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ عیسائی پادریوں کے مذہبی مباحث سے واقف نہیں تھے، ان کو مزدکیوں کے خیالات اور تصورات سے آگاہی نہیں تھی، لیکن وہ کلامی نوعیت کے سوالات اٹھارہے تھے اور اس کے جوابات مرتب کررہے تھے۔اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ مسائل جو علم کلام کے ابتدائی دور میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں، جن سے علم کلام کا خمیر اُٹھا، وہ خود حضرات صحابہ کرامؓ کے درمیان زیر بحث آئے۔جیسا کہ سیدنا عبداللہ ابن عباسؓ اور خوارج کے مابین مباحثہ سے اندازہ ہوتا ہے، جب حضرت علیؓ کے ارشاد پر سیدنا عبداللہ بن عباسؓ خوارج سے گفتگو کرنے کے لیے جاتے ہیں تو خوارج سے گفتگو میں وہ مسائل زیر بحث آتے ہیں جو بعد میں علم کلام کے اساسی مباحث بنے۔ظاہر ہے نہ خوارج یونانیوں کے تصورات سے واقف تھے نہ حضرت عبداللہ ابن عباس کو یونانیوں کی تحریروں سے آگاہی حاصل تھی۔

اسی طرح سے جن محدثین نے کلامی مسائل اٹھائے ان محدثین کی رسائی یونانی یا دوسرے علوم وفنون تک ہرگز نہیں تھی۔امام احمد بن حنبلؒ جب خلق قرآن پر اپنا مؤقف مرتب فرمارہے تھے تو ان کے روبرو یونانی تصورات ہرگز نہیں تھے۔ان چند مثالوں سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ علم کلام کا اصل خمیر اور ابتدائی آغاز قرآن پاک اور متعلقہ احادیث نبویؐ کی بنیادوں پر شروع ہوا۔قرآن پاک کی کم وبیش چھ ہزار چھ سو آیات ہیں۔ان میں سے چند سو آیات آیاتِ احکام کہلاتی ہیں، جن کا اندازہ مفسرین نے تین سو سے چار یا پانچ سو لگایا ہے۔تین سو سے کچھ کم آیات براہ راست آیات احکام ہیں اور اتنی ہی تعداد میں آیات بالواسطہ احکام سے متعلق کہی جاسکتی ہیں۔یہ وہ آیات ہیں جو فقہی معاملات: نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، نکاح وطلاق وغیرہ کے معاملات سے بحث کرتی ہیں۔بقیہ چھ ہزار سے زائد آیات بالواسطہ یا بلاواسطہ عقائد اور اخلاق سے بحث کرتی ہیں۔اس لیے عقائد سے متعلق قرآن پاک کی آیات کی تعداد آیاتِ احکام سے بہت زیادہ ہے۔۔۔قرآن پاک نے جو عقائد بیان کیے ہیں ان میں استدلال بھی ہے، حقائق اور عقائد کا بیان بھی ہے اور منکرین کے شبہات کا جواب بھی ہے؛ معاندین کے اعتراضات کا جواب بھی دیا گیا ہے، اور مکالمہ اور مجادلہ کے انداز کی گفتگو بھی ہے۔قرآن پاک کے اسلوب کا - خاص طور پر آیاتِ عقائد کے باب میں - جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے استقراء کا اسلوب زیادہ اپنایا ہے۔واقعات کی جزوی مثالیں دے کر قرآن مجید ایک بڑے کلیے کی نشان دہی کرتا ہے، جس تک قرآن پاک کا قاری خود بخود پہنچ جاتا ہے۔قرآن پاک میں خطابی دلائل بھی ہیں اور قیاس سے بھی کام لیا گیا ہے۔قرآن پاک میں اخلاقی دلائل بھی دیے گئے ہیں۔نبی علیہ السلام کے کردار مبارک، رحمت خداوندی، کفار اور مشرکین کا انجام اور نیکوکاروں کی نیک نامی کو اپنے بیانات کی تائید میں پیش کیا گیا ہے۔

یہی انداز احادیثِ عقائد کا ہے۔احادیث کے بڑے بڑے مجموعے، چاہے وہ تابعین کے زمانے کے نسبتاً چھوٹے

مجموعے ہوں، تبع تابعین کے دور کے نسبتاً بڑے مجموعے ہوں، یا بعد کے ادوار کے مبسوط اور جامع مجموعے ہوں، ان سب میں عقائد سے متعلق احادیث موجود ہیں، اور وہ سارے مباحث جو بعد میں متکلمین کے ہاں گفتگو میں زیر بحث آئے، وہ ان احادیث میں بیان ہوئے ہیں۔ جس طرح سے قرآن پاک نے یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے سوالوں کے جواب دیے ہیں، اعتراضات کو دُور کرنے کی کوشش کی ہے اور ان ایرادات کا تذکرہ کر کے ان کو صاف کیا ہے، اسی طرح احادیث میں بھی یہ مضامین موجود ہیں۔۔۔۔ یہ بات سیرت نگاروں نے بھی لکھی ہے، مفسرین نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے، محدثین کے ہاں بھی یہ روایات موجود ہیں کہ مشرکین اور یہودیوں میں ہجرت سے بہت پہلے سے مسلمانوں کے خلاف تعاون اور مشاورت کا سلسلہ قائم تھا۔ مشرکین مکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مجادلہ، یعنی ایک مذہبی مباحثہ، کرنے کے لیے یہودیوں سے مشورہ کیا کرتے تھے اور یہودی وقتاً فوقتاً مشرکین مکہ کو ایسے سوالات بھیجتے رہتے تھے جو ان کے خیال میں رسول اللہ ﷺ کے دعویٰ کی صداقت کو جانچنے کے لئے آپؐ سے کیے جانے چاہئیں تھے۔ سورہ کہف میں ذکر کیے گئے سوالات اس مشاورت و تعاون کی ایک اہم مثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سے واضح طور پر یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ کلامی بحث مباحثہ اور مذہبی معاملات میں مجادلہ مکی دور سے جاری ہے۔ اس مجادلہ میں یہودیوں نے بھی حصہ لیا، مشرکین نے بھی حصہ لیا اور خود صحابہ کرامؓ میں سے بعض ایسے حضرات بھی اس میں شریک رہے جنہوں نے اپنے بین الاقوامی سفروں کے دوران مختلف تہذیبوں سے اپنی واقفیت کی وجہ سے بعض سوالات رسول اللہ ﷺ سے پوچھے اور آپؐ نے ان سوالات کے تشفی بخش جوابات ارشاد فرمائے۔۔۔ یہ وہ ذخیرہ یا وہ خام مال تھا کہ جس پر علم کلام کی اساس رکھی گئی۔ جب علم کلام کو فنی اعتبار سے ایک الگ فن کے طور پر مرتب کیا جا رہا تھا تو سب سے پہلا سوال جو پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ عقل اور نقل میں تعارض ہے یا تطابق؟ عقل اور نقل میں تعارض کا مسئلہ دنیا کے ہر مذہب کو پیش آیا ہے۔ کچھ مذاہب تو اس سوال کا کوئی جواب نہیں دے پائے اور انہوں نے بہت جلد ہتھیار ڈال دیے، اور یکسو ہو کر یا تو عقل کو بنیاد بنایا یا پھر نقل کو۔ کچھ مذاہب نے اس کا جواب دینے کی کوشش کی لیکن اس جواب کو علمی انداز میں مرتب نہیں کیا۔ اس کے قواعد پر غور نہیں کیا اور اس تطابق کے اصول اور ضوابط مرتب نہیں کیے۔ اسکے برعکس اسلامی تاریخ میں متکلمینِ اسلام اور علمائے اصول نے جو بہت سی صورتوں میں ایک ہی شخصیت کے دو القاب تھے، ایک ہی شخصیت کے مختلف پہلو تھے، اس مطابقت کے اصول و ضوابط بھی مرتب کیے اور قواعد بھی، اور بالآخر وہ اتفاقِ رائے سے اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ منقول صحیح اور معقول صریح کے درمیان کوئی تعارض نہیں۔ یعنی وہ چیز جو یقینی طور پر رسول پاک ﷺ کی ذات گرامی سے ثابت ہے، مثلاً قرآن پاک ہے، تو وہ قطعی طور پر ثابت ہے۔ احادیث صحیحہ بھی اگر صحیح طور پر ثابت ہیں تو ان میں اور وہ چیز جو صراحتاً عقل کا تقاضا ہے ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔۔۔ ائمہ اسلام نے معقول کیساتھ صریح کی شرط ضرور لگائی ہے۔ اسلئے کہ عقلیات کے نام پر بہت سی کمزور اور ناپختہ باتیں بھی ہر دور میں کہی جاتی رہی ہیں۔ ہر دور کے عقلیین کا یہ اسلوب رہا ہے کہ کسی خاص وقت میں انکے ذہن میں جو سوالات یا خیالات پیدا ہوں انکو وہ عقل کا حتمی

اور قطعی تقاضا سمجھنے لگتے ہیں اور اس رطب و یابس کے ملغوبہ کو حتمی اور قطعی حقائق مان کر انکی بنیاد پر دینی مسائل وحقائق کے بارہ میں سوالات اٹھاتے ہیں۔ وقت کیساتھ ساتھ یہ ثابت ہوتا جاتا ہے کہ وہ چیزیں جن کو عقل کا حتمی اور قطعی معیار سمجھا گیا تھا وہ محض ایک رائے تھی جس کی بنیاد خالص قطعی دلائل پر نہیں تھی۔ ایسے سینکڑوں نہیں ہزاروں خیالات ہیں جو ماضی میں قطعیت کے ساتھ پیش کیے گئے اور ان کی بنیاد پر مذہبی عقائد کی تعبیر نو کی دعوت دی گئی، لیکن وقت نے بتایا کہ یہ خیالات محض افکار و آراء تھے، ان کی بنیاد حقائق پر نہیں تھی۔ اسلئے متکلمین اسلام نے پہلے دن سے صریح کی شرط لگائی ہے کہ جس حقیقت کے بارہ میں صراحت کیساتھ ثابت ہوجائے کہ یہ عقل کا لازمی اور قطعی تقاضا ہے اس میں اور صحیح المعقول میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ یہ بات امام طحاوی نے بھی لکھی ہے جو صدر اسلام کے مستند ترین متکلمین اور فقہائے اسلام میں سے ہیں۔ بعد کے تقریباً ہر دور میں، خواہ وہ ابن رشد جیسے فلسفی، متکلم اور فقیہ ہوں یا علامہ ابن تیمیہؒ جیسے امام الائمہ اور اپنے دور کے مجدد وقت ہوں، سب نے اس بات کو مختلف انداز سے واضح اور منقح کیا ہے کہ عقل اور نقل میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ امام ابن تیمیہؒ نے تو "درء تعارض العقل والنقل" کے نام سے اس موضوع پر ایک بھرپور اور ضخیم کتاب بھی لکھی ہے۔ ابن رشد کا رسالہ "فصل المقال فی مابین الحکمة والشریعة من الاتصال" اگرچہ مختصر ہے لیکن اس بارے میں بڑی شہرت رکھتا ہے اور اپنے زمانہ میں فلسفہ اور شریعت کے درمیان توازن اور توافق کا سب سے نمایاں اور قابل ذکر نمونہ کہلاتا تھا۔ فلسفہ یعنی عقلیات اور شریعت میں جو متفق علیہ معاملات ہیں وہ کیا ہیں؟ خود ہمارے دور میں برصغیر میں بیسویں صدی میں متعدد اہل علم نے اس سوال کو قوم کے سامنے رکھا اور عقل ونقل کے درمیان تطبیق اور توافق کے اصول کو بیان کیا۔ یہ بات غالباً دہرانے کی ضرورت نہیں۔ قرآن پاک کا ہر طالبعلم جانتا ہے۔ کہ قرآن مجید نے بے شمار مقامات پر، خالص مذہبی معاملات اور عقائد پر بات کرتے ہوئے بھی، انسانی عقل اور مشاہدے کو اپیل کیا ہے۔ فکر، تدبر، تعقل یہ الفاظ قرآن پاک میں اتنی کثرت سے بیان ہوئے ہیں اور اتنی کثرت سے ان کا حوالہ دیا گیا ہے کہ اب یہ ایک بہت پیش پا افتادہ بات کی حیثیت رکھتی ہے۔۔ جب یہ سوالات اٹھنے اور انکے علمی جوابات مرتب ہونے شروع ہوئے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ صحابہؓ اور تابعین ہی کے سامنے یہ سوالات آنے لگے تھے۔ تو ایک رجحان یہ پیدا ہوا کہ ایسے مجرد عقلی سوالات بھی اٹھائے جائیں جن کی کوئی عملی افادیت نہ ہو۔ یہ رجحان اسلام کی روح اور مسلمانوں کے مزاج کے خلاف سمجھا گیا۔ اس لئے کہ خالص عقلی اور غیر عملی سوالات اٹھانا اسلام کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اگر کوئی سوال واقعتاً کسی کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے اور اس کا جواب نہیں دیا جاتا تو اس بات کا خطرہ ہے کہ اسکے دل میں اسلام کے عقائد اور تعلیم کے بارہ میں کوئی بدگمانی یا وسوسہ جنم لے گا جو بعد میں جا کر پختہ ہوجائے گا۔ چنانچہ حقیقی اور واقعی پیدا ہونے والے اعتراضات اور سوالات کے جوابات دینا تو صحابہؓ اور تابعین نے اپنی ذمہ داری سمجھا۔ لیکن اگر سوال برائے سوال اٹھایا گیا ہو یا شبہ برائے شبہ پیدا کیا گیا ہو تو صحابہ کرامؓ نے اس طرح کے شبہات کا جواب دینا پسند نہیں کیا۔ (جاری ہے)